پروفیسر غلام احمد حریری

عربی زبان وادب پر قرآن کریم کے اثرات

ظہورِ اسلام سے پہلے زندگی کا تصوّر محدود تھا۔ اسلام کی آمد سے ایک نئے دَور کا آغاز ہوا۔ خیالات و افکار میں انقلاب آیا۔ قرآن کے آفاقی تصوّر نے زندگی کے افق کو وسیع کر دیا۔ اس انقلاب سے ہر شعبۂ حیات متاثر ہوا۔ قرآن کے زیرِ اثر علم وفن کے بہت سے نئے زاویے بنے۔ شعر وادب اور زبان پر بھی قرآن کے خوشگوار اثرات پڑے۔ قرآن مجید نے ادب میں حریتِ فکر، وسعتِ نظر، پاکیزگیٔ تخیّل اور بلندیٔ معنی کے اوصاف پیدا کیے۔ ادبِ عربی قرآن مجید سے قبل لفظی حسن وشوکت کا مرقع تھا اور اس کا مقصد محض جذباتِ سافلہ کی ترجمانی تھی۔ قرآن مجید نے آکر ادبِ عربی کو صوری ومعنوی حسن کے ساتھ جذباتِ عالیہ کی ترجمانی کے آداب سکھائے۔ یہ قرآن مجید کی تعلیم ہی کا فیضان ہے کہ آج عربی زبان تمام دنیا کے علوم وافکار سے معمور ہے۔ عربی زبان وادب کا محور قرآن مجید ہے۔

ادبِ جاہلی کا جو سرمایہ آج محفوظ شکل میں مل رہا ہے وہ سب قرآن مجید کی زبان کو محفوظ کرنے اور اسے سمجھنے کے لیے جمع کیا گیا تھا۔ مثلاً لسانی خامیوں کے سدِباب کے لیے علم صرف ونحو واشتقاق، قرآنی اعجاز کو ثابت کرنے کے لیے معانی اور بیان وبدیع۔ غریب الفاظ کی شرح وتوضیح کے لیے لغت وادب، احکام شرعیہ کے استنباط کے لیے حدیث۔ تفسیر، اصول اور فقہ وغیرہ علوم معرضِ وجود میں آئے۔ پھر قرآن مجید نے ان تمام علوم کو باقی رکھا اور اکنافِ عالم تک پہنچایا۔

"تاریخ ادب عربی کا مطالعہ کرنے والا دیکھے گا کہ یہ زبان جن نازک مرحلوں سے معجزانہ طور پر جان بچا کر نکل آئی یہ محض قرآن مجید کی قوت کا نتیجہ تھا۔ ورنہ دنیا کی بے شمار زبانیں اس سے بھی کمتر صدمات کی تاب نہ لاکر زندگی کھو بیٹھیں اور صفحۂ کائنات سے مٹ گئیں۔

قرآن مجید نے الفاظ ومعانی کے ضمن میں عربی زبان کی امکانی وسعتوں کو آشکارا کیا۔ اثر آفرینی کے سلسلہ میں حقائق پسندی، نفع بخشی اور افادی ہمہ گیری کو ملحوظ رکھنے کا درس دیا۔

حقیقت پسند ادب کا عقلی نمونہ پیش کرتے ہوئے اس قدیم مقولہ کی تردید کر دی کہ "اِنَّ اَعْذَبَ الشِّعرِ اَکْذَبُہٗ" (شعر جس قدر کذب پر مبنی ہوتا اتنا ہی شیریں ہوتا ہے) قرآن مجید نے ادب کا رُخ عدل و انصاف، خدمتِ انسانیت، تائیدِ حق و صداقت، نفاست پسندی، عفت و حیا اور خدا پرستی کی طرف پھیر دیا۔ اس نے ہر موضوع کو بیان کرنے کے لیے مناسب و پروقار اسالیب بخشے، غور و فکر اور دلائل و براہین سے کام لینے کی دعوت دی۔

قرآن مجید نے بتایا کہ ادب کا فریضہ یہ ہے کہ وہ طیبات کو معاشرہ میں مقبول بنائے اور خبائث کے لیے معاشرہ کی فضا ناسازگار بنا دے۔ قرآن مجید نے ادب کو یاس و قنوط کے مہلک جراثیم سے نجات دلا کر اسے جہادِ مسلسل، اور حیات آفرین رجائیت کا داعی بنایا تنقید کے لیے بلند اصول دیئے اور "احسن" کو اختیار کرنے میں کسی قسم کا تعصب نہ کرنے کی تلقین کی اس نے مدح و ہجو کے لیے نئے پیمانے مقرر کیے اور "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ" کا بلند ترین معیار عطا فرمایا۔

قرآن مجید نے عربی ادب میں حقائق کا اس طرح خمیر اٹھایا کہ اس کے بعد جس زبان میں بھی کسی شکل سے عربی ادب پہنچا۔ اس خمیر کی تائید نے اس زبان کو بھی فکری و معنوی بلندیوں سے ہمکنار کر دیا۔ آج دنیا کے ادب میں وحدتِ عالم، وحدتِ انسانیت، حریتِ فکر اور اخلاق کی جو حوصلہ افزائی ہو رہی ہے وہ اسی قرآنی ادب کی تاثیر کا نتیجہ ہے۔ اگر آج انسانیت اپنی آنکھوں سے تعصبات کی عینک اتارنے کی کوشش کر رہی ہے تو یہ قرآنی ادب کے فیض کا ثمرہ ہے۔ عربی زبان پر قرآن کریم کا اثر یہ ہوا کہ اس نے عربوں کے سخت اور بے رحم دلوں میں جاگزیں ہو کر انھیں نرم کر دیا۔ اور ان کی سطحی عقلوں میں داخل ہو کر انھیں ذہنی اور ٹھوس بنا دیا۔ چنانچہ قرآن مجید کے اس اصول نے ان کی زبان میں حسین الفاظ، خوبی تراکیب، نزاکتِ اسلوب، قوت گویائی، زورِ بیان، نیرنگئ معانی، کثرتِ مضامین و مطالب کی صفات کو جنم دیا۔ زبان کے دائرہ کو نئے دینی الفاظ تراش کر مثلاً "الصلوٰۃ" الزکوٰۃ، القیام، الرکوع، السجود، القنوت، الوضوء، المومن، الکافر و دیگر الفاظ تک وسعت دی۔

قرآن مجید سے عربی نثر جس درجہ فیض یاب ہوئی شاعری اس حد تک متاثر نہ ہو سکی خلفائے راشدین کے عہد میں جب فتوحات بڑھیں، اسلامی مملکت کی حدود میں وسعت آئی اور سیاسی و عمرانی مسائل میں اضافہ ہوا تو نثر کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ قرآن کے فیض و اثر نے اس دور کے طرز

نثر نگاری کو پر کیف سادگی عطا کی۔ خلفائے اسلام کے یہاں خط وکتابت کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں سہل ممتنع کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جو قرآن کے زیر اثر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کریم کی بدولت عربی نثر کا پایہ عربی شاعری کی بہ نسبت بہت بلند ہوگیا۔

تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شعر وشاعری بھی قرآن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ اسلام کی آمد سے شعراء کے فکر وفن کا مقصد بدل گیا اور ان کی شاعری اسلام کی ہمہ گیر تحریک سے وابستہ ہوگئی حضرت حسان، کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ کے کلام میں اسلامی شعور نمایاں ہے۔ لبید بن ربیعہ جیسے عظیم جاہلی شاعر کا یہ حال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر مشرف باسلام ہونے کے بعد شاعری ترک کردی۔ حضرت عمرؓ نے جب اس سے اشعار سننے کی فرمائش کی تو لبید کہا کہ اللہ تعالیٰ نے شعروں کے عوض مجھے سورۃ البقرہ دے دی ہے۔ (تاریخ الادب العربی احمد حسن زیات ذکر لبید بن ربیعہ ودیگر کتب تاریخ ادب عربی)

حضرت حسان اپنے دور کے عظیم شاعر تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو اسلام کی خدمت کے لیے وقف کردیا۔ یہ صحیح ہے کہ عربی شاعری اسلام کے ہمہ گیر نظام حیات کو مکمل طور پر اپنے اندر سمو نہ سکی۔ حیرت ہے کہ اسلام کے آفاقی تصور کو رومی اور اقبال نے اپنے کلام میں جس طرح جذب کیا اس کی مثال صدر اسلام سے لے کر دور عباسی بلکہ دور جدید تک کے عربی شعراء میں کہیں نہیں ملتی۔ تاہم عہد اسلام کے شعراء کے کلام کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فن کا وہ نبع یا اسلوب نہیں رہا جو دور جاہلیت کا خاصہ ہے۔ دور اسلام میں قرآن کریم کے زیر اثر جو شاعری پروان چڑھی کلام جاہلیت کے مقابلہ میں اس کا انداز نرم اور لطیف ہے۔ زبان شستہ، پاکیزہ اور نکھری ہوئی ہے۔ طرز ادا ستھری اور دلنشین ہے۔ سوقیت وابتذال کم یاب ہے۔ بقول ابن خلدون "مسلم فن کاروں کا فن نظم ونثر کلام جاہلیت سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

قرآن مجید کو عربوں کی زندگی میں مختلف پہلوؤں سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام کے بعد محض تشریعی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ان کی زبان، ادب اور ذہنی رجحانات کا بھی محور بن گیا۔ عربی زبان ولغت کی تدوین، اشعار کی تلاش وتحقیق، اسالیب بیان کے ارتقاء اور مختلف فنون ادب کے پروان چڑھنے میں قرآن مجید ہی سب سے بڑا محرک تھا۔ عربوں نے قرآن کا مطالعہ مختلف طریقوں سے کیا ہے۔ یہاں اس مطالعہ کا صرف ایک پہلو یعنی جو کچھ قرآن مجید کی زبان اور اسلوب بیان پر لکھا گیا ہے اسے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ قرآن مجید کے محاسن زبان پر بیشمار کتابیں لکھی گئی تھیں اور علماء نے یہ ثابت

کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن مجید کے اعجاز کا اصل مظہر اس کی زبان اور بلاغت ہے۔ اس سے عربی تنقید کو بہت فائدہ پہنچا۔ علماء نے نہ صرف قرآن مجید ہی کی زبان سے وقیع اور فنی بحثیں کی ہیں بلکہ وہ عربوں کی عام زبان اسالیب بیان، جاہلی و اسلامی شعراء کے اشعار عربوں کی روایات نحو، علم بدیع، علم بیان، علم معانی اور لغت وغیرہ کے دقیق مسائل کو بھی زیر بحث لائے ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن فہمی کے لیے عربی علوم و فنون کا عمیق مطالعہ درکار ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی کا خیال ہے کہ جب تک عرب قبل اسلام کی شاعری کا تحقیقی مطالعہ نہ ہوا و عربی بلاغت پر نظر نہ ہو اس وقت تک کما حقہٗ قرآن مجید پر نظر نہیں ہو سکتی۔

قرآن مجید اور عربی تنقید دونوں میں ایک بہت قریبی تعلق ہے اور جن لوگوں نے قرآن مجید کی زبان و اسلوب بیان پر کتابیں تصنیف کی ہیں وہ سب کے سب ناقد ادب تھے اور ان میں سے اکثر ایسے بھی ہیں جنھوں نے عربی تنقید پر الگ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔

تیسری صدی ہجری میں عربی تنقید کے متعلق بہت سی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ اس سے قبل کی کوئی کتاب موجود نہیں۔ اسی دور سے ناقدین عرب نے قرآن کی جانب بھی توجہ کی۔ مشہور نحوی فراء نے ایک کتاب "معانی القرآن" کے نام سے لکھی۔ ابو عبیدہ نے "مجاز القرآن" تصنیف کی اور تیسری صدی کے مشہور ناقد ابن قتیبہ نے "مشکل القرآن" لکھی۔ یہ تینوں کتابیں ابھی شائع نہیں ہوئی ہیں۔ ابن قتیبہ مشکل القرآن میں کہتے ہیں کہ قرآن کی عظمت کا عرفان اسی کو ہو سکتا ہے جس کی نظر میں وسعت ہو۔ جس کا علم عمیق ہو اور وہ عربوں کے مختلف اسالیب بیان و مکتب ہائے فکر سے واقف ہو۔

تمام ناقدین عرب نے بلا کسی استثناء کے قرآن مجید سے مثالیں پیش کی ہیں۔ قدامہ بن جعفر نے بہت کم آیات بطور مثال کے اپنی کتاب "نقد الشعر" میں پیش کیں۔ مگر چوتھی ہی صدی ہجری کے ایک دوسرے ناقد ابو الحسن اسحاق بن وہب الکاتب نے اپنی مشہور کتاب "البرہان فی وجوہ البیان" میں بے شمار قرآنی آیات سے استشہاد کیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس نے نظریات تو اخذ کیے ارسطو سے مگر مثالیں دیں قرآن سے۔ ارسطو کی کتاب الجدل اور کتاب الخطابۃ کے اثرات مذکورہ بالا کتاب پر بالکل واضح ہیں۔ یہ عجیب طرز تھا کہ عرب ناقد ارسطو اور دوسرے یونانی مفکرین سے نظریات و اصطلاحات اخذ کر کے ان کے لیے مثالیں قرآن مجید اور احادیث سے تلاش کرتے تھے۔ چنانچہ ابن معتز نے تیسری صدی ہجری میں، ابن وہب الکاتب نے چوتھی صدی ہجری میں اور عبد القاہر الجرجانی نے پانچویں صدی ہجری میں بالکل یکساں طریقہ اختیار کیا۔

چوتھی صدی ہجری کے اواخر سے پانچویں صدی اور اس کے بعد کے اکثر ناقدوں نے اپنی کتاب کے دو مقاصد قرار دیئے۔ ایک دینی مقصد اور دوسرا ادبی۔ انھوں نے قرآن مجید میں تنقید کی بنیادیں تلاش کیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح انھوں نے جاہلی شاعری وغیرہ کو مرکز توجہ بنایا۔ چنانچہ ابوالہلال عسکری نے اپنی کتاب "الصناعتین" کے مقدمہ میں صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ میری کتاب کے دو اہم مقاصد ہیں۔ ایک ادبی خدمت اور دوسری دینی خدمت، بالکل یہی انداز ابن سنان خفاجی نے سر الفصاحۃ میں اختیار کیا ہے۔ عبدالقاہر جرجانی نے تو مستقل دو کتابیں ہی ان دونوں مقاصد پر لکھیں۔ بلاغت پر ان کی کتاب "اسرار البلاغۃ" بہت مقبول و مشہور ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کی زبان اور اس کے محاسن پر ان کی دوسری کتاب "دلائل الاعجاز" غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ ان دونوں کتابوں میں انھوں نے جہاں مثالیں اشعار ادب سے دی ہیں وہاں قرآن مجید سے بھی پیش کی ہیں۔

اس سلسلہ میں انھوں نے ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ جاحظ نے تیسری صدی ہجری میں ایک بحث یہ اٹھائی کہ کلام میں حسن کا مرجع الفاظ ہیں یا معانی؟ انھوں نے لفظ کو معانی پر ترجیح دی تھی اور بتایا تھا کہ معانی تو دیہاتی، شہری اور جاہل سب ہی جانتے ہیں اصل حسن تو الفاظ کے قالب میں ہے۔ عبدالقاہر جرجانی نے اس نظریہ کی تردید کی اور کہا کہ حسن الفاظ میں نہیں معانی میں پوشیدہ ہے "دلائل الاعجاز" میں انھوں نے اس نظریہ کو اس طرح پیش کیا کہ قرآن میں بھی حسن کلام کا مرجع الفاظ میں نہیں معانی میں ہے اور معانی میں بھی براہ راست نہیں بلکہ نظم معانی میں کیفیت حسن پوشیدہ ہے۔ ابوتمام کی شاعری عربوں کے مالوف طرز شاعری سے مختلف تھی۔ اس میں استعارے، تشبیہات نئے مضامین اور نئی تراکیب کثرت سے استعمال کی گئی تھیں اور ساتھ ہی فلسفیانہ خیالات بھی کسی حد تک پیش کیے گئے تھے۔ یہ ایسی چیزیں تھیں جن سے عربوں نے اجنبیت محسوس کی اور عرب ناقد دو طبقوں میں منقسم ہو گئے۔ بالکل یہی صورت حال متنبی کے ساتھ بھی پیش آئی اس لیے کہ اس نے بھی ابوتمام کا طرز اختیار کیا اور اس سے بہت آگے بڑھ گیا اور اس کے بارے میں نقاد عرب دو گروہوں میں بٹ گئے۔ صاحب بن عباد اور حاتمی وغیرہ نے بہت کچھ اس کے خلاف لکھا۔ مگر قاضی جرجانی اور ثعالبی وغیرہ نے اس کی موافقت میں بہت اچھے انداز سے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا۔

ابوتمام کی شاعری کے اختلافات سے دراصل "علم بدیع" کا آغاز ہوا۔ اس لیے کہ اس کی بیشمار اقسام کا استعمال اس کی شاعری میں ہوا تھا۔ اس وقت یہ عام خیال تھا کہ یہ بالکل ایک نیا علم ہے جو عربوں میں یونانیوں سے آیا ہے۔ ابن معتز (متوفی ۲۹۶ھ) نے کتاب البدیع تصنیف کی اور اس

میں یہ نظریہ پیش کیا کہ "علم بدیع" عربوں کے یہاں ایام جاہلیت سے موجود ہے اور تمام عرب جدید وقدیم شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں بھی موجود ہے۔ ابن معتز نے کثرت سے قرآنی آیات سے استشہاد کیا ہے۔

"مذہب بدیع" کے حاملین نے قرآن مجید سے خاص طور سے کیوں مثالیں پیش کیں؟ اس کا جواب زغلول سلام نے یہ دیا ہے کہ اس طرح انھوں نے یہ کوشش کی کہ جو کچھ ابوتمام اور ان کے مقلد شعراء نے کیا تھا اس کو صحیح ثابت کریں۔

علم بدیع کے علاوہ علم بیان اور معانی پر بھی قرآن مجید کے اثرات پوری طرح نمایاں ہیں۔ اور بیشمار آیات ناقدین عرب نے قرآن مجید سے پیش کی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلوب کا اصل معیار ہمیشہ قرآن مجید رہا ہے اور ناقدوں نے اس کا خاص خیال رکھا ہے کہ قرآن مجید نے کس انداز سے اور کن الفاظ و تشبیہات کے ذریعہ مفہوم کو ادا کیا ہے اور اس کو معیار حسن و بلاغت سمجھا ہے۔

"اعجاز القرآن" پر رمانی (متوفی ۳۸۴ھ) اور خطابی (متوفی ۳۸۸ھ) کی کتابیں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ رمانی کی دس اقسام بدیع مشہور ہیں۔ ان کو ابوبکر باقلانی نے بھی اپنی کتاب "اعجاز القرآن" میں نقل کیا ہے۔ یہ اقسام دراصل چوتھی صدی میں معروف ہو چکی تھیں۔ہاں بعض اختلافات البتہ قابل ذکر ہیں۔

۱۔ رمانی نے اطناب اور تطویل کا فرق اعجاز القرآن میں واضح کیا ہے۔

۲۔ تلاؤم اور اس کی مختلف قسموں اور تنافر کے درمیان فرق کو بھی انھوں نے بیان کیا ہے۔

۳۔ تواصل کی تشریح کر کے اس کا اور "اسجاع" کا فرق بھی نمایاں کیا ہے۔

۴۔ "مناسبت" کا بھی بیان اعجاز القرآن میں موجود ہے۔

۵۔ تصریف کی تشریح بھی رمانی نے کی ہے۔

اعجاز القرآن پر سب سے بہتر کتاب ابوبکر باقلانی کی ہے۔ انھوں نے اس بحث میں بیشمار مسائل تنقید کو اپنا مرجع قرار دیا ہے، ان کا طرز استدلال یہ ہے کہ پہلے کسی مسئلہ کو لے کر اس کی دقتوں کو بیان کرتے ہیں پھر شعراء عرب کو دکھاتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے اس بارے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں وہ نمونہ پیش کیا ہے جس سے تمام شعراء و اہل زبان عاجز ہیں۔

باقلانی کہتے ہیں کہ کلام مختلف حیثیت کا ہوتا ہے کچھ بلند اور کچھ پست۔ ایک معنی سے دوسرے معنی کی طرف انتقال فنکار کی عظمت کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور اکثر لوگ اس مشکل میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ مگر قرآن مجید کی عظمت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اس میں ایک معنی سے دوسرے معنی کی طرف اس طرح انتقال ہو جاتا ہے کہ کوئی بھدا پن اور غیر مناسب عبارت ظاہر نہیں ہوتی اور ایک عجیب حسن و کشش اس حیثیت سے قرآن مجید میں نظر آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اکثر شعرائے عرب نے اس میدان میں ٹھوکر کھائی ہے۔ چنانچہ بحتری جیسا عظیم شاعر جب "نسیب" سے مدح کی طرف منتقل ہوتا ہے تو اکثر بہت بھدا انداز اختیار کر لیتا ہے اور بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے (اعجاز القرآن ابوبکر باقلانی ص ۵۶-۵۷)

باقلانی کا خیال ہے کہ ایک شاعر ایک صنف میں تو غیر معمولی اہمیت اور عظمت کا حامل ہوتا ہے مگر جب وہی کسی دوسری صنف سخن پر طبع آزمائی کرتا ہے تو بہت ہی گر جاتا ہے اور کم ایسا ہوتا ہے کہ شاعر تمام اصناف میں یکساں حیثیت رکھتا ہو۔ اس طرح بعض فن کار نثر میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں مگر جب وہ شاعری میں قدم رکھتے ہیں تو بہت نیچے گر جاتے ہیں اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔

اپنے اس نظریہ کے پیش نظر وہ شعرا کی مندرجہ ذیل اقسام بیان کرتے ہیں۔

۱۔ کچھ شاعر ایسے ہیں جو "مدح" کے بادشاہ ہیں مگر ہجو میں بالکل صفر ہیں۔

۲۔ کچھ ایسے ہیں جو ہجو بہترین کرتے ہیں مگر مدح میں ان کا کوئی مقام نہیں۔

۳۔ بعض شعراء کو تقریظ (مدح) میں یدِ طولیٰ حاصل ہوتا ہے مگر وہ تابین (مرثیہ) میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

۴۔ کچھ شعراء تابین (مرثیہ) میں سبقت رکھتے ہیں مگر تقریظ (مدح) نہیں کر پاتے۔

۵۔ اس طرح بعض شعراء وصف میں بہت ممتاز ہوتے ہیں، اونٹ، گھوڑے، رات کے چلنے شراب پینے، جنگ کی تصویر کشی اور غزل کے رقیق موضوعات کے بیان کرنے میں بہت ممتاز ہوتے ہیں۔ اس موقع پر باقلانی عربی تنقید کی مشہور مثل کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عربوں نے یہ تبصرہ اس صلاحیت کی بنیاد پر کیا تھا کہ "امرؤ القیس" سب سے بڑا شاعر ہے جبکہ وہ اونٹ پر سوار ہو۔ نابغہ ذبیانی سب سے بڑا شاعر ہے جب کہ وہ خوف زدہ ہو جائے اور زُہیر اس موقع پر سب سے بڑا شاعر ہے جب کہ وہ لالچ اور طمع محسوس کرے۔ اَعشیٰ اس

وقت سب سے بڑا شاعر ہے جب کہ اس نے پی لی ہو اور خوش ہو۔ (اعجاز القرآن باقلانی صفحہ ۴۵)

عربی تنقید کے مشہور مسئلہ سے وہ تعرض کرتے ہیں اور الفاظ و معانی کی بحث پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ بہترین کلام وہ ہے جس میں معانی الفاظ کے موافق ہوں اور کلام لفظ و معنی کے لحاظ سے باہم مطابقت رکھتا ہو، ان دونوں عناصر میں سے کسی کی زیادتی نہ ہو، جب یہ کیفیت ہوگی تو فن و فصاحت کو زیادہ بہتر انداز سے نمایاں ہونے کا موقع ملے گا۔ اس موقع پر باقلانی بڑی دلچسپ بحث کا آغاز کرتے اور کہتے ہیں کہ "جن" بھی اشعار کہتے ہیں۔ انھوں نے جنوں کے سترہ اشعار نقل کر کے لکھا ہے کہ وہ بھی قرآن کے مثل کلام کہنے سے عاجز ہیں۔ باقلانی نے پہلے یہ بتایا ہے کہ عمدہ کلام کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں:۔ کلام میں حسب موقع طوالت و اختصار ہو۔ استعارہ تصریح اور تحقیق ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اوصاف قرآن کریم میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ (اعجاز القرآن ص ۶۲)

باقلانی نے ایک باب میں قرآن میں "سجع" کے وجود کی نفی کی ہے وہ کہتے ہیں کہ "سجع" میں معنی لفظ کے تابع ہو جاتے ہیں جب کہ قرآن میں الفاظ معانی کے تابع ہیں۔

احمد صقر نے اس نظریہ کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "سجع" کی مذکورہ تعریف صحیح نہیں ہے۔ اس طرز کا استعمال تو کمزور فن کاروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ سجع کی اعلیٰ قسم وہ ہے جس میں الفاظ کو ان کی موزوں و مناسب جگہ بھی ملتی ہے اور وہ معانی کے تابع بھی ہوتے ہیں۔ یہی وہ "سجع" کی قسم ہے جو اپنی مکمل شکل میں احادیث میں وارد ہوئی ہے اور اس کو وہ لوگ جو "سجع" کے قائل ہیں قرآن مجید میں ثابت کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ جو مسجع کلام قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے وہ کلام کی اعلیٰ ترین قسم ہے اور بلاغت کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے (اعجاز القرآن للباقلانی مع مقدمہ از سید احمد صقر ص ۸۵)

باقلانی ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ بلاغت کا انحصار بدیع کی عمدہ شکلوں کے استعمال، لطیف معانی، عمدہ حکمتوں اور مناسبت اور یکسانیت کلام پر ہے جو قرآن مجید میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ آگے چل کر وہ مزید کہتے ہیں کہ بہترین کلام وہ ہے جس کو کان اپنا سرمایہ سمجھیں اور نفس انسانی اس کی جانب پوری طرح متوجہ ہو جائے اور جس کی رونق دور سے اس طرح نظر آجائے جیسے موتیوں کے ہار کی چمک۔ حسن کلام کی یہ صفت پہلے ہی جملہ سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ باقلانی نے آسان اور سلیس کلام ہی کو معیار قرار دیا۔ غریب، وحشی اور مستکرہ کلام کو ناپسند کر کے اچھے کلام کی تعریف اس طرح کی کہ جب تم اس کو سنو تو وہ تمہارے دل میں بیٹھ جائے اور تم کو ایسی حلاوت و خوشگواری

محسوس ہو جیسی کہ تم آبِ زلال پیتے وقت محسوس کرتے ہو لیکن اس کے باوجود وہ کلام تمہارے اختیار سے اتنا ہی دُور ہو جیسے ستارہ کو ڈھونڈھنے والے سے ستارہ دور ہو جاتا ہے۔

ایسا کلام نفس سے قریب تر اور ذہن سے مانوس ہوتا ہے مگر اس کا کہنا آسان نہیں ہوتا۔

پھر باقلانی پر تبصرہ کرتے ہیں کہ تمام ادباء و شعراء نے غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے، صرف قرآن مجید کی زبان غلطیوں سے مبرّا ہے۔

باقلانی نے قرآن سے شعر کی نفی کی ہے، ان کا خیال ہے کہ شعر وہی ہے جو موزوں، مقفّٰی ہو اور اجزاء میں تناسب ہو اور وہ متساوی ہوں۔ اس کا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ وہ "شعر منثور" کے بھی منکر تھے۔

شاعری کے متعلق ان کا نظریہ تھا کہ بلا قصد کے وہ وجود میں آئی۔ جب لوگوں نے اس کو دیکھا تو بہت پسند کیا اور اس انداز پر کلام کہنے کا رواج عام ہوا۔ ان کی نظر میں منظوم کلام منثور کلام سے بہتر اور فصیح ہوتا ہے۔ (اعجاز القرآن ص ۲۳۶)

باقلانی ایک موقع پر رقمطراز ہیں کہ حُسنِ کلام کا اصل مرجع انسانی طبیعت ہے۔ جو بات عمداً کہی جائے اس میں وہ لطف نہیں ہوتا جو کیفیتِ حسن بلا قصد کے محاسن کلام کے استعمال ہو جانے میں ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں باقلانی ایک اور حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ موجودہ دور (یعنی پانچویں صدی ہجری) میں لوگ آورد کے ذریعہ محاسنِ کلام کے شائق ہو گئے ہیں حالانکہ متقدمین کے یہاں ان محاسن کا ذریعہ آمد تھی اور ان کا استعمال اتفاق سے ہو جاتا تھا۔

تعجب تو یہ ہے کہ باقلانی نے نہ صرف یہ کہ زبان، شاعری، خطبات اور نثر وغیرہ کے تنقیدی مسائل سے بحث کی ہے بلکہ ناقد کے فرائض اور فنِ تنقید کے بارے میں بھی بہت سی قیمتی آراء کا اظہار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ صرّاف کی نظر جس طرح سونے پر ہوتی ہے اور بزاز کی نگاہ جس طرح کپڑے کو پہچانتی ہے بالکل اسی طرح ناقد کی نظر کلام پر بہت گہری ہوتی ہے اسی انداز سے باقلانی ناقدوں کے اختلاف کا ذکر کرتے ہیں اور مختلف مسائل پر بحث لاتے ہیں۔ یہ ایک مفصل نمونہ تھا ان کتابوں میں سے ایک اہم کتاب کا جو اعجاز القرآن پر لکھی گئیں۔ اس سے بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے دقیق تنقیدی مباحث کا اثر عربی تنقید پر پڑنا ایک ناگزیر حقیقت ہے۔

باقلانی کہتے ہیں کہ تمام عربی شاعری میں غلطیاں موجود ہیں اور اس سلسلہ میں امرؤ القیس کے قصیدہ کے ایک ایک شعر کو لے کر اس کی غلطیاں واضح کرنے کی کوشش کی ہے، وہ تنقید اس لحاظ

سے اہم ہے کہ اس کے بعد انھوں نے قرآن مجید کی زبان اور اس کے بیان کے محاسن کا تفصیل سے ذکر کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن کی زبان سب سے اہم اور اعجاز کا نمونہ ہے جس سے انسان عاجز ہیں (اعجاز القرآن صفحہ ۲۴۹)

قرآن مجید پر جن لوگوں نے لکھا اور اس کی زبان اور اس کے اسلوب پر مختلف حیثیتوں سے بحث کی ان سب ناقدوں یا علماء نے کوئی ایک نہج اپنی بحثوں میں اختیار نہیں کیا بلکہ اپنے ذہن وخیال اور اپنے زمانہ کے تنقیدی رجحانات کے پس منظر میں انھوں نے قرآن مجید کے محاسنِ زبان کو سامنے لانے کی کوشش کی اس بنا پر میرا خیال یہ ہے کہ ڈاکٹر زغلول سلام کا یہ نظریہ صحیح نہیں کہ عربوں کے دو مکتب فکر تھے "علم تنقید میں "مذہب بدیع" اور "مذہب عربی" کو دو اہم تنقیدی رجحانات سمجھتے ہیں۔ یہ تقسیم تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں دونوں مکتب ہائے فکر کا صحیح نقشہ موجود نہ تھا۔ وہ یہ بھی نہیں کہہ پاتے کہ "مذہب بدیع" قرآن سے دور رہا اور "مذہب عربی" کا مرکز قرآن مجید رہا۔ بلکہ طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ قرآن اصحاب بدیع کا محور بن گیا اور انھوں نے جتنے بھی تنقیدی پیمانے بنائے ان کا میار قرآن اور اعجاز قرآن کو قرار دیا اور اس راہ سے ہٹ گئے۔ جس کی جانب علماء اعجاز قرآن نے ان کو توجہ دلائی اور بتایا کہ قرآن مجید کے اسلوب میں محض فنونِ بدیع ہی اس کی عظمت کے حامل نہیں۔ بلکہ اس کے پس منظر میں معانی اور روحِ بیان وغیرہ ہیں جو ایک توازن اور کشش کی ضامن ہیں۔ (اثر القرآن فی تطور النقد الادبی ص ۳۳۷)

قرآن مجید کو علم بدیع کے حامیوں نے اپنے اوپر اعتراضات سے بچنے کے خیال سے مرجع بنایا اور یونانیوں سے نظریات اخذ کر کے انھیں قرآنی مثالوں کے ساتھ پیش کیا۔ اس سے یہ ایک بڑا فائدہ ہوا کہ ایک جانب عربی تنقید میں نظریاتی پہلو کا اضافہ ہوا۔ اس لیے کہ اب تک جو تنقید عربوں کے یہاں موجود تھی وہ دراصل عملی تنقید تھی اور سطحی فکر و ذوق پر منحصر تھی۔ اس طرح عربوں میں ایک بلند اور نظریاتی فکری تنقید کی بنیاد پڑی۔ دوسری جانب عربی تنقید کو یہ فائدہ پہنچا کہ قرآن مجید کے استشہاد کی وجہ سے عربوں نے کچھ دن ضرور غیر عربی خیالات سے اجنبیت محسوس کی اور آمدی نے قدامہ کے نظریات کے خلاف کتاب لکھی۔ اور میرا خیال ہے کہ ان لوگوں نے جنھوں نے اعجازِ قرآن پر کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے عرب مکتب فکر اور یونانی مکتب فکر دونوں کے اختلافات سے قطع نظر کر کے قرآن مجید کے محاسن کو اجاگر کرنے کے لیے دونوں خیالات سے فائدہ اٹھایا جیسا کہ باقلانی کی کتاب سے محسوس ہوتا ہے۔

اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ زغلول سلام نے قرآن پر اس حیثیت سے غور نہیں کیا کہ علماءِ اعجاز قرآن خود کسی مسلک کے حامل تھے بلکہ اپنے دور کے مروجہ تمام مسالک سے وہ قرآن مجید کے محاسن کو واضح کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر مذہب عربی کا مرکز صرف قرآن ہی ہوتا تو آمدی کے یہاں ہم کو علم بدیع اور اس کی اقسام نظر نہ آتیں، خود باقلانی نے بدیع اور اس کی اقسام سے بحث کی ہے اور اس کے ذریعہ قرآن مجید کی عظمت کو نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اس بحث سے میرا مطلب یہ ثابت کرنا ہے کہ علماء اعجاز قرآن کا کوئی الگ مکتبِ فکر عربی تنقید میں نہ تھا بلکہ وہ مذکورہ دونوں تنقید کے اسکولوں سے استفادہ کرتے تھے، اس طرح یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ عربی تنقید کے دونوں مکتب ہائے فکر پر قرآن مجید کے اثرات نمایاں ہیں اور یہ نظریہ صحیح نہیں کہ کوئی بھی مکتبِ فکر قرآن مجید سے دور رہا۔

زغلول سلام نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بدیع مکتبِ فکر کا مرجع چونکہ یونانی خیالات تھے لہٰذا وہ قرآن مجید کے اثرات سے دور رہا، اس کے برعکس عربی مکتبِ خیال کے ناقدوں نے اپنا مرجعِ فکر قرآن مجید کو بنایا اور قرآن مجید کے اسلوبِ بیان ہی کو مضبوطی سے پکڑے رہے، عربی تنقید میں یہ خالص قرآنی طرز فکر ان کی نظر میں بدیع اسکول اور یونانی خیالات کا عملی طور پر ردِّ عمل تھا اور بدیع مکتبِ فکر کے مقابلہ میں عربی مکتبِ فکر وجود میں آیا (اثر القرآن فی تطور النقد الادبی ص ۳۳۳)

یہ تو ایک بدیہی امر ہے کہ عربی تنقید کے تمام مکاتب فکر نے قرآن مجید سے استشہاد کیا ہے اور اس کو زبان و بیان کا نمونہ بنایا ہے، مجھے تعجب ہوتا ہے کہ عربوں کے جس خالص مکتبِ فکر کی جانب زغلول سلام اشارہ کرتے ہیں۔ اس میں تو ذرا بھی کہیں قرآن کا اثر نمایاں نہیں ہے۔ مثلاً تیسری صدی ہجری میں ابن قتیبہ نے "الشعر والشعراء" میں جو تنقیدی بحثیں کی ہیں ان میں تمام استشہاد قدماء و متاخرین کے اشعار سے کیا گیا ہے۔ یہی حال ابوالعباس ثعلب کی "قواعد الشعر" کا ہے۔ آمدی اور قاضی جرجانی جن کو ڈاکٹر محمد مندور خالص عرب ناقد قرار دیتے ہیں۔ وہ بھی "موازنہ" اور "وساطہ" میں قرآن سے استشہاد نہیں کرتے بلکہ واقعہ تو یہ ہے "قرآن مجید کو نمونہ کے طور پر جن لوگوں نے پیش کیا ان میں اکثریت انھیں ناقدوں کی ہے جن کا تعلق 'مذہب بدیع' سے ہے (النقد المنہجی عند العرب ص ۶۸)

ثعلب اور ابن قتیبہ بھی قرآن ہی کو اپنا مرجع و ماخذ سمجھتے تھے لیکن شاعری پر بحث کے دوران انھوں نے قرآن مجید کو مثالاً نہیں پیش کیا جب کہ بدیع اسکول کے ناقدوں نے اپنی کتابوں میں عربی شاعری اور قرآن مجید دونوں ہی سے مثالیں تلاش کیں۔ ابن قتیبہ نے "مشکل القرآن" میں قرآن مجید کی زبان کو دنیا

کی تمام زبانوں پر ترجیح دی اور افضل بتایا ہے (اثر القرآن ص ۱۱۹)

زغلول کے نظریہ پر میں نے اس لیے بحث کی تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان کی فکر میں "بدیع یا یونانی اسکول تنقید" سے وہ تعصب موجود ہے جس کا ابو تمام کے زمانہ سے اکثر عرب ناقد شکار رہے ہیں ورنہ قرآن مجید کے اثرات تو عربی تنقید کے بنیادی عناصر میں ہیں جن سے پوری عربی تنقید نے قوت اور توانائی حاصل کی ہے۔

کتاب الصوم

مشکوٰۃ المصابیح

کی کتاب الصوم پر مشتمل

۱۴۷ احادیث نبویؐ کی بصیرت افروز تشریحات کا گرانقدر مرقع

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

مرتبہ

حفیظ الرحمٰن احسن

ایم۔اے اسلامیات کے طلبا کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ

★ سفید کاغذ ★ نہایت معیاری کتابت ★ آفسٹ کی نظر افروز طباعت اور

★ چہار رنگ شاہکار سرورق کے ساتھ

★ ہدیہ ۸/۵۰ روپے

مکتبہ آئین، ریلوے روڈ، لاہور

ایوان ادب۔ اردو بازار۔ لاہور فون نمبر ۶۷۱۶۶